زبان کا زخم

مائل خیرآبادیؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زبان کا زخم

گونے کے بعد پہلی بار بھائی اُسے لینے آیا تھا۔ وہ بہت خوش تھی راجہ مہاراجوں کے یہاں نوکروں کی کیا کمی لیکن راج بہو سمترا دیوی دوڑ دوڑ کر بھائی کی خاطر تواضع کر رہی تھی اس کا شوہر راج کمار رنبیر سنگھ بھی بہت خوش تھا۔ رنجیت سنگھ اسی کی عمر کا تھا۔ رنجیت سنگھ کو آئے تین دن ہو چکے تھے۔ رنبیر نے ایک لمحہ کے لیے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ سمترا کی طرح اس نے بھی بہنوئی کا دل بہلانے میں کمی نہیں کی۔ وہ اسے شکار کے لیے لے جاتا۔ سیر و تفریح کراتا اور ایسی باتیں کرتا کہ رنجیت سنگھ خوش ہو جاتا۔

ایک دن چوکے میں رنبیر سنگھ اور رنجیت سنگھ پاس پاس بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

رنجیت سنگھ کھانا کھا چکا تو اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کے ہاتھ کھینچتے

ہی رنبیر نے بھی ہاتھ روک لیا۔

سمترا دیوی بھائی کے آنے کی خوشی میں بات بات پر کوئل کی طرح کوک رہی تھی۔ اس نے بھائی اور شوہر کو دیکھتے ہوئے کہا:۔

"میرے بھائی نے آج تو اس طرح کھایا جیسے شیر کھاتا ہے اور پتی دیو (رنبیر) تو اس طرح کھاتے رہے جیسے لومڑی۔

یہ بات راج بہو نے بھائی کو خوش کرنے کے لئے کہی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کا پتی تو اس کا ہے ہی اور اس کے دَم کے ساتھ ہے۔ بھائی دو دن کے لیے آیا ہے۔ لاؤ دو دن کے لیے جیسے بنے اُسے خوش رکھا جائے۔ اُس نے بھائی کو شیر اور پتی کو لومڑی کہا تو رنجیت ہنس دیا لیکن رنبیر یک دم اُداس ہو کر رہ گیا۔ سمترا نے زیادہ دھیان نہیں دیا۔ شام کو رنبیر اپنے بہنوئی رنجیت کو لے کر شکار کو چلا۔ پہلے جب وہ شکار کو جاتا تو شکاری کتے اور لاؤ لشکر ساتھ ہوتا لیکن آج صرف رنجیت سنگھ کے ساتھ شکار کھیلنے کا پروگرام بنایا۔ دونوں جنگل میں جا کر شکار کھیلنے لگے۔ تھوڑی دیر تک دوڑ بھاگ کرتے رہے کچھ ہاتھ نہ آیا تو رنبیر نے رنجیت سے کہا:۔

"جی چاہتا ہے کہ آج سمترا کے شیر سے ایک لومڑی دو دو ہاتھ کرلے۔"

کیا مطلب جیجا جی!" رنجیت کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس کے پوچھنے پر رنبیر نے کہا۔

"تلوار میان سے نکال لیے۔ پھر بتاؤں" اور یہ کہہ کر خود اس نے تلوار سونت لی۔

"سمترا کے شیرا وار لو" اور یہ کہہ کر اس نے تلوار کا وار رنجیت پر کر دیا رنجیت اس کے لیے تیار نہ تھا۔ بھاری زخم اس کے کندھے پر آیا۔ اپنے کو بچانے کے لئے اس نے بھی تلوار نکال لی اور پھر جنگل میں دو بجلیاں چمک چمک کر ایک دوسرے پر گرنے لگیں۔

رنجیت اپنے کو بچا رہا تھا۔ خود وار نہیں کر رہا تھا۔ وہ اپنے جیجا پر وار کر ہی کیسے سکتا تھا۔ اگر کہیں اس کے وار سے رنبیر کی جان چلی جائے تو بہن بیوہ ہو جائے گی اور عمر بھر کلنک کا ٹیکہ اپنے ماتھے پر لگے گا لیکن رنبیر اس پر پلا پڑ رہا تھا۔ وہ سچ مچ بپھرا ہوا تھا اور تابڑ توڑ تلوار چلائے جا رہا تھا۔ آخر ہوا یہ کہ رنجیت زخم پر زخم کھاتے کھاتے گھوڑے سے گر گیا اور مر گیا۔ زخم رنبیر کے بھی آئے تھے لیکن وہ ایسے نہیں تھے کہ اس کی جان کو خطرہ ہوتا۔ اس نے سمترا کے شیر کی لاش اپنے گھوڑے پر رکھی اور گھر آ کر اس کی بہن کے سامنے ڈال دی

سمترا بھائی کی لاش دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا کہ یہ کیسے اور کیا ہو گا۔ وہ دوسرے دن اپنے میکے جانے کو تیار ہو رہی تھی۔

"ہائے رام یہ آج کیا ہو گیا" اس کی زبان سے نکلا اور وہ بے ہوش ہو کر بھائی کی لاش پر گر پڑی ہوش میں آنے کے بعد شوہر سے پوچھا "یہ کیا ہو گیا؟"

رنبیر نے بتایا "تمھارے شیر کو ایک لومڑی نے مار گرایا"

"اوہ!" سمترا دیوی نے انگلی دانتوں تلے دبائی اُسے یاد آگیا کہ اس نے کھانا کھاتے وقت کیا کہا تھا۔ ایک آہ اس کے منہ سے نکلی "یہ کیا کیا تم نے پتی دیو؟" اور پھر اس نے رونا دھونا ختم کر دیا۔ بھائی کی لاش اس نے باپ کے پاس بھجوا دی اور ساری بات لکھ کر بھیج دی۔

کہتے ہیں کہ پھر سمترا کو کسی نے کسی دن ہنستا نہیں دیکھا۔ اس کا شوہر رنجیت کی تلوار سے زخمی ہوا تھا۔ اُس کے زخم اچھے ہو گئے۔ ایک دن سمترا نے اس کے زخموں کا حال پوچھا۔ رنبیر بولا۔

"سمترا کے شیر کی تلوار سے جو گھاؤ بدن پر آئے تھے وہ تو اچھے ہو گئے لیکن سمترا کی زبان کا زخم ویسا ہی ہرا ہے۔"

بوڑھیا کی مدد

پُرانا امام باڑہ کسی زمانے میں بڑا عالی شان امام باڑہ تھا۔ آج کل تو سُونا پڑا رہتا ہے۔ اس کا ایک طرف کا حصّہ بالکل گر گیا ہے۔ دوسری طرف دو حُجرے سے ہیں۔ ان میں سے ایک پچھلی برسات میں گر گیا۔ اس میں ایک بوڑھیا رہا کرتی تھی۔ ان دونوں حجروں کے سامنے ایک گنبد نما عمارت بنی ہے اس عمارت کی کرسی اتنی اونچی ہے کہ اس پر جانے کے لئے زینہ بنا ہے۔ اس عمارت کی گنبد پر کلس لگا ہوا تھا۔ پچھلی برسات میں اس کلس پر بجلی گری۔ اور ایک ایسا حادثہ پیش آیا جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس میں ہم سب کے لیے بڑی نصیحت ہے اور اس کے سننے میں کہانی کا سا مزا آتا ہے۔ اچھا تو لیجئے۔ آپ بھی سنیے۔

رشید اور اکبر دو دوست تھے۔ دونوں ایک ہی اسکول میں پڑھتے

تھے ایک ہی درجے میں تعلیم پارہے تھے ۔ ماسٹر صاحب ہوم ورک کے لیے جو کچھ دیتے ، دونوں دوست اسی گنبد نما عمارت میں جاکر کیا کرتے تھے پچھلی برسات میں ایک دن ایسا ہوا کہ ہوم ورک کرتے کرتے مغرب کا وقت ہو گیا مغرب کے وقت بادل گھر آئے ۔ پانی برسنے لگا ۔ بجلی کڑکنے لگی ۔ پھر تو ایسا موسلا دھار پانی برسا کہ جل تھل ہو گیا ۔ دونوں نے ہوم ورک کا کام لپیٹ کر رکھ دیا تھا اور اب وہ یہ سوچ رہے تھے کہ پانی کا برسنا کب ختم ہو اور وہ گھر پہنچیں ۔

انھوں نے دیکھا ، سامنے امام باڑے کے ایک حُجرے میں ایک چراغ ٹمٹما رہا ہے اور ایک بوڑھیا ہے جو حجرے کا سامان کبھی ایک طرف رکھتی ہے ، کبھی دوسری طرف ۔ دونوں سمجھ گئے کہ حجرہ ٹپک رہا ہے اور بوڑھیا اپنا سامان پانی سے بچاتی پھرتی ہے ۔

گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پانی برسا پھر رک گیا ۔ لیکن بادل اسی طرح گھرے ہوئے تھے ۔ بجلی بھی چمک رہی تھی ۔ بجلی کی چمک کے ساتھ ساتھ ایسی کڑک دار آواز آتی کہ دل ہل جاتا ۔ اتنے میں "دوارڑ" ، اڑ ادھڑام انہیں دیوار گرنے کی آواز سنائی دی ۔ انھوں نے بوڑھیا کے حُجرے کی طرف دیکھا ۔ جی ہاں ! اسی حُجرے کی ایک طرف کی دیوار گر گئی تھی ، اور بوڑھیا کا آدھا جسم اینٹوں کے اندر دب گیا تھا ۔ بوڑھیا بے چاری مدد کے لئے چیخ رہی تھی ۔ رشید نے اکبر سے کہا :۔

"یار ! اس وقت ہمیں چاہیے کہ چل کر اس بوڑھیا کی جان بچائیں ۔

اللہ ہمارے اس کام سے خوش ہو گا۔"

یہ سُن کر اکبر نے جواب دیا "میں تو ایسی اندھیری رات میں یہاں سے ہٹ کر نہ جاؤں گا۔" رشید نے اسے بہت سمجھایا۔ ثواب کا لالچ دیا مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ بوڑھیا برابر چلّائے جا رہی تھی اور آسمان پر تڑ تڑ تڑ تڑ بجلی کڑک رہی تھی۔

بوڑھیا کی حالت رشید سے دیکھی نہ گئی۔ وہ اکیلا ہی کھڑا ہوا گنبد نما عمارت سے اترا اور جا کر بوڑھیا کے اوپر سے اینٹیں ہٹانے لگا بجلی کڑکتی تو رشید کا دل دہل جاتا مگر اسے تو اللہ کو خوش کرنا تھا وہ ثواب کے لالچ میں بوڑھیا کی جان بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دس پندرہ منٹ میں اس نے بوڑھیا کو نکال لیا۔ بوڑھیا کو نکال کر وہ یہ سوچنے لگا کہ اسے کہاں لے جائے اور کیسے لے جائے؟ اس نے اکبر کو پکارا "دیار! اب تو آجاؤ، گھر تو چلنا ہی ہے آؤ، اس بوڑھیا کو لادے چلیں۔

اکبر اب بھی نہ آیا۔ وہیں سے بولا "تم ہی ثواب لوٹو۔ میں اس وقت تک یہاں سے نہیں ٹلوں گا جب تک بادل نہ چھٹ جائیں" اکبر یہ کہہ ہی رہا تھا کہ بجلی زور سے کڑکی۔ گنبد نما عمارت کے کلس پر گری اور نیچے اترتی چلی گئی۔ اس نے عمارت میں دراڑیں ڈال دیں بجلی کے گرتے ہی اکبر ہائے کر کے گرا۔ اور پھر اس کی آواز سنائی نہیں دی۔ رشید

دوڑکر اس کے پاس گیا۔ دیکھا تو اکبر مرچکا تھا۔ اس کا سارا جسم جھلس کر کالا پڑ گیا تھا۔ اب رشید ایک لاش کے بدلے دو لاشیں لے جانے کی تدبیر سوچ رہا تھا اور دل ہی دل میں کہہ رہا تھا "کیا اچھا ہوتا کہ اکبر میرے ساتھ اس بوڑھیا کی مدد کو چلا آتا۔"

ایک لاکھ کا قرضہ

مرزا صاحب تھے تو چالیس گاؤں کے تعلق دار لیکن رہتے تھے نوابوں اور راجاؤں کی طرح ۔ مرزا صاحب کے یہاں دس ہاتھی، پچاس گھوڑے، سو کتے ولایتی، تین چیتے اور دو شیر پلے تھے ۔ گایوں بھینسوں کی گنتی اس لیے نہیں بتائی جاسکتی کہ انہیں ادلا بدلا جاتا رہتا تھا۔ گائیں بھینسیں کبھی دس بیس بڑھ جاتیں اور کبھی آٹھ دس گھٹ جاتیں ۔

ذرا سوچیے تو، جس کے یہاں اتنے جانور پلے ہوں اس کا خرچ کتنا ہوگا؟ ہم تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ لیکن ہم نے سنا ہے کہ ان سب پر ہر مہینے ہزاروں روپیہ خرچ ہوتا تھا۔ جو شخص جانوروں پر اتنا خرچ کر ڈالے، وہ اپنے عیش و آرام پر نہ جانے کتنا خرچ کرتا ہوگا۔ جن لوگوں نے مرزا صاحب کے بارے میں ہم کو یہ سب بتایا ان کا کہنا ہے کہ مرزا صاحب اپنے باپ دادا کے بعد جب

تعلقہ کے مالک ہوئے تو چار پانچ برس میں ہی راجہ صاحب کبیر پور کے قرض دار ہو گئے اور یہ قرضہ بڑھتے بڑھتے ایک لاکھ کے قریب پہنچ گیا۔

مرزا صاحب بے فکری کے ساتھ الّے تلّلے پیسہ خرچ کر رہے تھے کہ ایک دن راجہ صاحب کبیر پور کے یہاں سے قرض کا روپیہ مانگا گیا۔ یہ پہلا دن تھا کہ مرزا صاحب کو روپیہ کے بارے میں سوچنا پڑا۔ مرزا صاحب نے سوچ بچار کے بعد راجہ صاحب سے کچھ دنوں کی مہلت لی اور راجہ صاحب نے مہلت دے بھی دی۔

اب سنئے۔ راجہ صاحب کبیر پور کی ایک لڑکی تھی۔ لڑکی تھی تو دیکھنے میں اچھی بھلی۔ ناک نقشہ بھی اچھا تھا۔ لیکن ذرا ذرا سانولی تھی۔ گوری چٹّی رنگت نہ ہونے سے خوبصورت نہیں ہی جا سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ابھی تک اس کی شادی نہ ہو سکی تھی۔ رجواڑوں میں سے کوئی اس سے شادی کرنے کو تیار ہی نہ ہوتا تھا انہیں گوری چٹّی اور خوبصورت بیویوں کی کمی کیا تھی کہ ایک سانولی لڑکی کو اپنی بیوی بناتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ راجہ صاحب کبیر پور کی لڑکی کی عمر پچیس سال سے زائد ہو گئی

مرزا جی کو ان دوستوں نے مشورہ دیا کہ آپ اس لڑکی کے لئے پیغام بھیجئے۔ اگر یہ شادی ہو گئی تو پھر راجہ صاحب سے قرض معاف کرانے میں آسانی ہو جائے گی۔ مرزا صاحب تیار ہو گئے۔ شادی کا پیغام دیا۔ راجہ صاحب نے جھٹ منظور کر لیا اور پھر چٹ منگنی پٹ بیاہ بھی ہو گیا۔ شادی ہونے کے

بعد مرزا جی نے راجہ صاحب سے خود بھی کہا اور بیوی سے بھی کہلوایا۔ لیکن راجہ صاحب نے قرض معاف کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ بلکہ دھمکی دی کہ تین مہینے کے اندر پورا قرضہ ادا نہ ہوا تو عدالت کے ذریعے وصول کرا لیا جائے گا۔ یہ دھمکی سن کر مرزا جی کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ انھوں نے بیوی سے کہا کہ اگر آپ کے والد صاحب نے دعویٰ کر دیا تو ہمارے سارے گاؤں بک جائیں گے۔ جاکر ان سے دو چار سال کی مہلت لے لو۔ تمہارا کہنا مان لیں گے میری نہیں سنیں گے۔

بیٹی نے باپ سے کہا۔ راجہ صاحب نے تین سال کی مہلت دے دی مرزا جی سوچنے لگے کہ قرض کیسے ادا کیا جائے؟ اب دیکھیے یہی سانولی لڑکی جس کے ساتھ بڑے لوگ شادی نہیں کرتے تھے، کیسی سمجھ دار نکلی۔ اس کی سمجھ داری پر ہمیں پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث یاد آ گئی جس میں یہ ہے کہ اگر بیوی کسی اعتبار سے تم کو پسند نہیں ہے تو تم صبر کرو۔ ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر اس کی کسی اچھی بات سے تم کو فائدہ پہنچ جائے۔ تو ایسا ہی ہوا بیوی نے مرزا جی کو رائے دی کہ آپ کے یہاں ہزاروں روپیہ مہینے کا بہت سا بے کار خرچ ہوتا ہے۔ اگر آپ اسے ختم کر دیں تو قرضہ تین سال کے اندر ادا ہو سکتا ہے۔ یہ جو بہت سے ہاتھی گھوڑے، شیر چیتے اور کتے وغیرہ پلے ہیں اگر انہیں ختم کر دیا جائے تو پہلا فائدہ یہ ہوگا کہ ان کے بیچنے سے بیس پچیس ہزار

روپیہ ہاتھ آجائے گا۔ اس طرح چوتھائی قرضہ مہینہ بھر کے اندر ہی ادا ہو جائے گا۔ اس کے بعد ہر مہینے ان پر جو ہزاروں روپیہ خرچ ہوتا ہے وہ بچے گا۔ اسے قسط وار دیتے رہیے۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا فضل فرمائے گا۔

مرزا جی پریشان تھے ہی۔ بیوی کی بات ان کی سمجھ میں آگئی انھوں نے ساری فضول خرچی ختم کردی۔ پھر وہی ہوا جو بیوی نے کہا تھا۔ پچیس ہزار روپیے تو انھوں نے پہلے ہی مہینے میں ادا کر دیے۔ اس کے بعد ٹیپ ٹاپ کے اور بہت سے بیکار خرچ ختم کیے۔ دس ہزار روپیہ اس سے بچا۔ دوسرے مہینے یہ بھی دے دیے۔ پھر حساب دیکھا تو معلوم ہوا کہ پانچ ہزار روپے مہینہ جانوروں پر خرچ ہوتا رہا ہے۔ یہ پانچ ہزار روپیہ ہر مہینے قرض کی مد میں ادا کرنے شروع کر دیئے۔ اس طرح تین سال کے بدلے ڈیڑھ سال کے اندر ہی ایک لاکھ کا قرض ادا ہو گیا۔

جب قرض ادا ہو گیا تو ایک دن راجہ صاحب نے مرزا صاحب کو بلایا اور کہا کہ تم بہت سمجھ دار آدمی نکلے۔ دیکھو اگر میں تمھارا قرض معاف کر دیتا تو تم اسی طرح فضول خرچی کرتے اور تم کو ہوش نہ آتا۔ اب میں سمجھ گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے اندر بڑی خوبیاں رکھ دی ہیں تم انتظام کرنا چاہو تو بڑی سی بڑی ریاست کا انتظام کر سکتے ہو، سنو! اب میں تم کو اپنی ریاست کا انتظام سونپتا ہوں اور تمھیں اپنا مدارالمہام (جنرل منیجر) بنانا چاہتا ہوں بولو تمھیں منظور ہے؟

مرزا جی ایک بہت بڑی ریاست میں یہ عہدہ پاکر بہت خوش ہوئے۔ پھر تو انھوں نے جس طرح اپنے تعلقے کا انتظام کیا تھا اسی طرح محنت سے ریاست کبیر پور کی دیکھ بھال کرنے لگے۔ اب ہر شخص خود ہی سمجھ سکتا ہے کہ پھر انہیں دنیا میں کیسا سُکھ ملا ہو گا؟ آپ قصّہ سُن چکے۔ اب خود سمجھ لیں اور اس قصّے سے نصیحت حاصل کریں۔

مالدار کون؟

ایک تھا آدمی، جوان آدمی۔ اس کے دو ہاتھ تھے، دو پیر تھے۔ دو آنکھیں تھیں۔ دو کان تھے۔ اچھا خاصہ ڈیل ڈول تھا۔

"ہی ہی ہی.....!" آج بھائی جان نے اس طرح کہانی شروع کی تو ہم سب "ہی ہی ہی ہی" کر کے ہنسنے لگے۔ رجّو آپا بولیں:۔ "یہ کیسی ہے کہانی۔۔ ہاتھ، پیر، آنکھیں اور کان تو آدمی کے ہوتے ہی ہیں"

اصل میں یہی سوچ کر ہم سب بھی ہنس رہے تھے۔ بھائی جان نے ہمیں ہنستا ہوا دیکھا۔ وہ خود بھی ہنسنے لگے۔ پھر بولے:۔

"کہانی سنو۔ بڑی مزے دار ہے اور اس میں سب کے لیے بڑی نصیحت ہے۔

"اچھا بھائی! سنائیے۔ دیکھیں اس آدمی سے ہمیں کیا نصیحت

ملتی ہے؟ شوکت نے مسکراتے ہوئے کہا اور بھائی جان کہانی سنانے لگے۔

"اچھا تو وہ تھا نوجوان آدمی مگر تھا بڑا غریب اور سست بھی اور کام چور بھی۔ کام دھام تو کرتا نہ تھا۔ ہاں شام کو جامع مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو کر بھیک مانگا کرتا تھا"۔

"بھائی جان! آپ اسے جانتے تھے کیا" سعید نے پوچھا۔

"جانتا تو نہ تھا مگر جان گیا۔

"وہ کیسے؟" سعید نے پوچھا۔

"ایسے کہ ایک دن میں مغرب کی نماز پڑھ کر جامع مسجد سے نکل رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ سامنے ایک کار آکر رکی۔ وہ کار کی طرف دوڑا۔ کار میں ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کوئی رئیس معلوم ہوتا تھا۔ کسی کام کے لیے اس نے باہر جھانکا تو جوان بھکاری نے اس کے آگے ہاتھ پھیلا دیے۔ رئیس نے ایک نظر اسے دیکھا پھر بولا۔ "شرم نہیں آتی۔ یہ جوانی، یہ ڈیل ڈول اور بھیک مانگ رہے ہو"

"حضور! غریب آدمی ہوں۔ خدا کے نام پر کچھ دے دیجیے"

"تم غریب آدمی، اللہ نے دو ہاتھ دیے، دو پیر دیے۔ آنکھیں اور کان دیے اور یہ گٹھا ہوا بدن دیا اور اپنے کو غریب بتاتے ہو۔ تم تو

جو چاہو کر سکتے ہو۔ مجھے دیکھو، غریب تو میں ہوں۔

یہ کہہ کر اس رئیس نے دکھایا کہ ایک ہاتھ سے ٹُولا اور ایک ٹانگ سے لنگڑا ہے اور اس کی ایک آنکھ نقلی لگی ہے ——— پھر کہنے لگا۔

" دس ہزار روپیے لے لو۔ اپنی ایک ٹانگ دیدو، جوان بھکاری چُپ کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ میں بھی کار کے پاس جا پہنچا اور ان کی باتیں سننے لگا۔

" ارے واہ ! شوکت باجی کو مزا آنے لگا۔ بولیں۔ " ارے واہ !——— پھر تو بھکاری کچھ جواب نہ دے سکا ہوگا "

" جواب کیا دیتا۔ اس نے پھر کہا۔ اچھا بیس ہزار لے لو اور اپنا ایک ہاتھ مجھے دے دو "

" واہ بھئی واہ " رجو آپا کہنے لگیں۔" اب تو اس نوجوان بھکاری کی آواز ہی بند ہو گئی ہو گی۔

" ہاں، سنو تو۔ اس سے رئیس نے پھر کہا۔" اچھا تو چالیس ہزار روپیے لے لو۔ اپنی ایک آنکھ مجھے دے دو۔

بھکاری چپ کھڑا تھا۔ اس سے کوئی جواب بن نہیں پڑ رہا تھا۔

"خوب قائل کیا اس رئیس نے " حامد نے پوچھا۔ بھائی جان

پھر کیا ہوا؟"

"ہوا کیا۔ جوان بھکاری چُپ کھڑا تھا اور شرم کے مارے اس کے سارے بدن سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ اس نے گردن جھکائی تھی "تین منٹ کے بعد اس رئیس نے کہا۔

"اچھا لے، یہ ایک روپیہ لے۔ لیکن یاد رکھ! "خدا جسے ذلیل کرنا چاہتا ہے اس سے بھیک منگواتا ہے۔" یہ بات پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمائی ہے۔ اب تو جانے اور تیرا ایمان۔"

"تو پھر اس نے روپیہ لے لیا؟" میں نے بھائی جان سے پوچھا۔ بھائی جان نے کہا۔

"نہیں اس نے روپیہ نہیں لیا۔ وہ چپکے سے واپس لوٹ پڑا۔

"ارے واہ، خوب ـــ نصیحت بھی بڑے موقع سے ملی اُسے۔

ہم سب نے کہا۔ "اس کے بعد اس نے بھیک مانگنے سے توبہ ہی کر لی ہوگی۔ ہے نا! بھائی جان!

"ہاں سچ مچ اس نے پھر بھیک نہیں مانگی۔"

آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ رجّو آپا نے سوال کیا۔

"مجھے اس طرح معلوم ہوا کہ ایک دن میں دفتر جا رہا تھا۔

راستے میں ایک نیا مکان بن رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہی جوان وہاں اینٹیں اٹھا رہا تھا۔ میں اس کے پاس گیا۔ اُس نے مجھے دیکھا میں نے اسے دیکھا۔ ہم دونوں مُسکرائے۔

"ہاں مسکرائے تو ہوں گے آپ دونوں"

"پھر آپس میں سلام علیک ہوئی۔ پھر میں نے پوچھا۔

"کہو بھائی! کتنے کی مزدوری کر لیتے ہو؟"

بولا:۔ کہ میں مزدوری نہیں کرتا۔ ٹھیکے پر کام کرتا ہوں۔ دو ہزار چوکے اٹھاتا ہوں۔ ایک ایک دن میں چار چار پانچ پانچ ہزار چوکے اٹھا کر اندر چٹّا لگا دیتا ہوں۔ ڈھائی تین سو روپیہ مہینہ کماتا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے تندرست بنایا۔ اب میں اپنے آپ کو غریب نہیں سمجھتا۔ مجھے اللہ نے بڑا مال دار بنایا ہے۔ مجھے یہ ہٹّا کٹّا تندرست بدن کیا دیا۔ سمجھیے کہ بہت بڑی دولت ہے یہ۔ پہلے میں نے اس کی قدر نہیں کی۔ اس دن تو آپ وہاں موجود تھے۔ اس لنگڑے رئیس نے میری آنکھیں کھول دیں۔

" ارے تم سب چپ کیوں ہو؟ کہانی کہتے کہتے بھائی جان نے ہم سے کہا۔

ہم سچ مچ چپ تھے۔ اور چپ ہی رہے۔ بھائی جان کہنے لگے۔

"اچھا تو تمھیں تعجّب ہو رہا ہے۔ اچھا لو۔ اور زیادہ تعجّب کرو۔ یا پھر نصیحت حاصل کرو۔

وہ جو میرے دوست احمد یار خاں صاحب ہیں نا! حامد میاں تم تو ایک دن میرے ساتھ ان کے محل میں گئے تھے۔ کیسا اچھّا بنا ہے ان کا محل! وہی تو تھے، وہ جوان بھکاری، جن کا حال میں نے تمھیں سنایا۔

"ارے وا ! احمد یار خاں صاحب!" ہم سب ہکّا بکّا ہو کر رہ گئے اور پھر اپنے اپنے ہاتھ پیر دیکھنے لگے۔ ہمیں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ہمارے سارے بدن میں ایک طاقت اُبھر رہی ہے۔ بھائی جان مسکرائے اور اپنے کام میں لگ گئے۔

ہندو کی مسلمان بیٹی

میرے دوست مولانا حکیم محمد عبداللہ صاحب کہتے ہیں کہ ہمارے وطن قصبہ روڑی میں سیدا نامی ایک مسلمان تھا۔ اس کی ایک لڑکی تھی۔ لڑکی کا نام نڈی تھا۔ نڈی کی شادی موضع صورتیہ میں ہوئی تھی۔ اس کے شوہر کا نام فضل دین عرف فجا تھا۔ شادی کے بعد فجا نے نڈی پر بڑی سختیاں کیں۔ وہ اسے ستانے لگا۔ تکلیفیں دینے لگا۔ کئی سال نڈی سسرال میں ستم پر ستم سہتی رہی۔ لیکن بڑے صبر کے ساتھ شوہر کے ساتھ رہتی رہی۔ ایک روز اس کے کسی خیر خواہ نے اسے بتایا کہ تیرا خاوند تجھے زہر دینے کی سوچ رہا ہے اور وہ سچ مچ آج کل ہی میں زہر دے دے گا۔ اگر اپنی زندگی چاہتی ہے تو میکے بھاگ جا اور اپنی جان بچالے۔ بات یہ تھی کہ نڈی شکل وصورت کے اعتبار سے فجا کو

پسند نہ تھی۔ وہ پہلے ہی دن سے مڈی کے خلاف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مڈی مرجائے تو دوسرا بیاہ کرے۔

مڈی یہ سب جانتی تھی۔ اس نے اپنی خدمت اور خوشامدانہ باتوں سے چاہا کہ شوہر کو رام کرے مگر وہ کامیاب نہیں ہوئی۔ جب زہر دینے کی بات سنی تو اسے پورا یقین ہو گیا اور وہ سسرال سے نہایت خاموشی سے بھاگ نکلی۔ قصبہ روڑی قصبہ صورتیہ سے چار پانچ میل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ مڈی جان کے ڈر سے بھاگم بھاگ جا تو رہی تھی مگر وہ میکے جانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا بھائی بہت غریب تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بھائی پر بوجھ بنے۔ وہ یہ بھی سوچتی تھی کہ میکے جاؤں گی تو شوہر آ کر لے جائے گا اور پھر مجھے اس کے ظلم کا نشانہ بننا پڑے گا۔ وہ اس وقت بہت پریشان تھی۔ وہ خدا سے دعا کر رہی تھی کہ خدایا! کوئی عزت کی جگہ مل جاتی جہاں زندگی گذار دیتی۔

خدا کی قدرت وہ ابھی روڑی پہنچی نہیں تھی۔ راستے میں اُسے روڑی کا ایک شریف آدمی کاہن سنگھ ذیل دار مل گیا۔ کاہن سنگھ اسے پہچانتا تھا۔ مڈی نے اسے دیکھا تو "چاچا سلام" اس کی زبان سے نکل گیا۔ کاہن سنگھ نے دعا دی۔ پھر حال پوچھنے لگا۔ اس کے

حال پوچھنے پر نڈّی کا دل بھر آیا اور وہ رونے لگی ۔ کاہن سنگھ نے حال پوچھا تو اس نے سارا قصّہ سنایا۔ ذیل دار نے اُسے دلاسا دیا اور پھر کہنے لگا۔ ''بیٹی مت گھبرا۔ مجھ کو باپ کی جگہ سمجھ۔ اپنے گھر واپس جا۔ میں فجا سے نبٹ لوں گا۔''

یہ سن کر نڈّی اور زیادہ رونے لگی ۔ اس نے ذیل دار سے کہا ''جب آپ مجھے بیٹی کہہ چکے ہیں اور مجھ سے کہتے ہیں کہ میں آپ کو باپ سمجھوں تو میں نے آپ کو باپ مان لیا۔ اب تو کاہن سنگھ میرا باپ ہے اور اس کے بیٹے میرے بھائی۔ باپ! بیٹی کو اپنے ہی گھر میں پناہ دے دو۔

پناہ دینے کی بات پر ذیل دار نے کچھ سوچا اور پھر اُسے اپنے گھر لے گیا ۔ اس کے چھ بیٹے تھے۔ اس نے اپنے بیٹوں سے کہا۔ ''تم چھ بھائی ہو۔ یہ ساتویں بہن ہے۔ اس سے وہی سلوک کرو جو سگی بہنوں سے کیا جاتا ہے۔''

بیٹوں نے باپ کے آگے سر جُھکا دیا۔ انھوں نے نڈّی کو بہن بنایا اور سچّی بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنے قول کو نبھایا۔ کچھ دنوں کے بعد جب کاہن سنگھ ذیل دار کا انتقال ہو گیا اور اس کے بعد اس کا بڑا لڑکا سوہن سنگھ ذیل دار ہوا تو اس وقت اس کی

والدہ زندہ تھی۔ اس نے بھی مڈّی کو بیٹی سمجھا اور اس طرح سمجھا کہ مڈّی کا اختیار گھر میں بڑھنے لگا۔ ہندو مسلمان کا ہاتھ اپنے کھانے پینے کی چیزوں میں نہیں لگانے دیتے۔ لیکن مڈی باورچی خانے میں جا سکتی تھی۔

یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مڈی نے دین اسلام ترک کر دیا اور وہ ہندو ہوگئی۔ نہ ایسی بات نہ تھی۔ وہ اب بھی مسلمان تھی۔ وہ روزے نماز کی بڑی پابند تھی۔ اسے ایک کوٹھری ایسی دے دی گئی تھی جس میں اس کی جانماز بچھی رہتی۔ اس کے بھائی اور بھاوجیں اس کا بڑا خیال رکھتی تھیں۔ روزوں کے زمانے میں اس کی سحری اور افطاری کا باقاعدہ انتظام کیا جاتا تھا۔ مطلب یہ کہ وہ عام دین دار لوگوں کی طرح دین داری کے ساتھ اس گھر میں رہتی تھی۔ ہاں پردہ نہیں کرتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دیہات میں کچھ بہت اونچے لوگوں کے علاوہ مسلمان عورتیں پردہ کم ہی کرتی ہیں۔

کاہن سنگھ کہنے کو سکھ تھا مگر وہ دراصل ہندو تھا۔ اس کے گھر میں ہندوؤں کے یہاں کے مشرکانہ تہوار منائے جاتے تھے اور اسی طرح چڑھاوے چڑھتے تھے جس طرح ہندو چڑھاتے ہیں لیکن مڈّی انھیں حرام سمجھتی تھی۔ وہ اس موقع پر پکائے ہوئے کھانوں کو ہاتھ نہیں لگاتی

تھی۔ اس نے جب پہلی بار یہ بات دیکھی تو اپنے ہندو ماں باپ سے کہہ دیا کہ مسلمان غیر اللہ کے جڑھاوے اور نذر کے کھانے نہیں کھاتا پھر گھر بھر کے لوگوں نے اس سے کبھی نہیں کہا کہ کھائے اور نہ کبھی مجبور کیا۔

جب سوہن سنگھ کی والدہ بھی نہ رہی تو سوہن سنگھ نے اپنے بھائیوں کے ساتھ باقاعدہ سکھ دھرم اپنا لیا۔ کچھ دنوں بعد جب اکالی تحریک چلی تو سوہن سنگھ اس میں شریک ہو گیا۔ اس کے باقاعدہ سکھ ہونے سے گھر کے ہندوانہ شرک کی باتیں ختم ہو گئیں۔ ماں نے اپنے کمرے میں کچھ مورتیاں رکھ چھوڑی تھیں۔ وہ علیحدہ کر دی گئیں۔

والدہ کے انتقال کے بعد اب گھر کی بڑی بوڑھی ٹڈی کو مان لیا گیا۔ اب گھر کا پورا انتظام ٹڈی کے ہاتھ میں آ گیا۔ گھر میں کوئی کام ٹڈی کے حکم کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ چھ بھائی اور ان کی بیویاں سب کے سب ہر کام ٹڈی سے پوچھ کر کرتے تھے۔ زمین بیچی جاتی تو ٹڈی کے حکم سے۔ زمین خریدی جاتی تو ٹڈی کے حکم سے۔ سامان گھر سے کہیں جاتا یا گھر میں آتا تو ٹڈی کی اس پر نظر رہتی۔ ہل بیل اونٹ سب پر ٹڈی کا قبضہ تھا۔ کبھی کبھی بھائی غلطی کرتے تو ٹڈی بری طرح ان کو لتاڑتی۔ ایک بھائی کو ایک بار بُری راہ چلتے سنا اور پھر جب یقین ہو گیا تو گھر میں

اسے پیٹا بھی۔ اس نے اس گھر میں وہ مقام حاصل کر لیا تھا کہ بھائی اس کی خوشامدیں کرتے اور بھاوجیں اس کے آگے لونڈی بنی رہتیں۔

اس طرح لگ بھگ پینتیس برس کی عمر میں مڈی اپنے ہندو باپ کے گھر ہی مری۔ بھائیوں نے اسلامی طریقے سے اس کا کفن دفن کیا۔ آج روڑی اور اس کے آس پاس یہ واقعہ وہ بوڑھے جانتے ہیں جو اس وقت بچے تھے۔ وہاں کے یہ بوڑھے جب مڈی کے بارے میں کسی کو پورا حال سناتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ آج ہندو مسلمان اس طرح ایک دوسرے کو کیوں نہیں مانتے؟ یہ ایک سوال ہے ان کے سامنے سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا جواب ہندوستان کے رہنے والے اپنے عمل سے کیا دیں؟

ضدّی لڑکے

ایک آدمی تھا۔ وہ پہلے تو بڑا غریب تھا۔ پھر اس نے خوب محنت کی۔ اس نے محنت کی تو اللہ نے مہربانی فرمائی۔ اللہ میاں کسی کی محنت کو بے کار نہیں کرتے۔ اچھا تو اللہ میاں نے مہربانی فرمائی تو اس آدمی کے گھر میں بڑی برکت ہوئی۔ برکت ہوئی تو آرام سے زندگی گزرنے لگی۔ اس محنتی آدمی کو کام بھی زیادہ سے زیادہ ملا۔ اسے مزدوری بھی بہت ملی۔ اس مزدوری میں سے اس نے کھایا پیا، بال بچوں کا پیٹ پالا اور کچھ نہ کچھ بچاتا بھی رہا دھیرے دھیرے اس کے پاس اتنی رقم جمع ہوگئی کہ وہ اپنا مکان بنوا سکتا تھا۔

مکان بنوانے میں اسے ایک پریشانی تھی۔ وہ کمانے کے لیے شہر جایا کرتا تھا، اور اس کا گھر تھا گاؤں میں۔ اب اگر گھر پر راج مزدور

لگایا جائے اور خود شہر چلا جائے تو راج مزدور کام تھوڑا بھی کریں گے اور کام بگاڑیں گے بھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کرے؛

اس آدمی کے چار بیٹے تھے۔ اس نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ اگر تم راج مزدوروں کی دیکھ بھال کرو اور ان سے کام لے سکو تو میں کام شروع کروا دوں اور خود کام کرنے شہر چلا جاؤں۔ بیٹوں نے بات مان لی۔ کہا کہ ہم کام کرا لیں گے۔

یہ سن کر آدمی نے راج مزدور بلائے۔ کام شروع کرا دیا۔ اس کے بعد شہر چلا گیا۔ یہاں مکان بننے لگا۔ دیواریں اونچی ہونے لگیں۔ ابھی دیوار ہاتھ بھر ہی اونچی اٹھی ہو گی کہ چاروں بیٹے اپنی اپنی کہنے لگے۔ ایک بولا کہ جب مکان تیار ہو جائے گا تو میں دروازوں کو ہرے رنگ سے رنگواؤں گا۔ دوسرے نے کہا۔ "نہیں لال رنگ ٹھیک رہے گا۔" تیسرا بولا۔ لال نہیں، نیلا رنگ بہت اچھا رہے گا۔" چوتھے نے کہا۔ "پیلے رنگ سے بہتر کوئی رنگ نہیں، میں تو پیلے رنگواؤں گا۔"

ہر ایک اپنی اپنی پسند کی بات کہنے لگا۔ ہر ایک ضد کرنے لگا کہ اس کی پسند کو سب پسند کر لیں۔ ایک دوسرے کی پسند کو تو کسی نے مانا نہیں اور آپس میں لڑ پڑے اور ضد میں آ گئے کہ ہم تو اپنی پسند کا رنگوائیں گے۔ یہ کہنے کے ساتھ یہ بھی کہتے کہ دیکھیں تو کون دوسرے

رنگ کا رنگوا تا ہے۔"

یہ سب اپنی اپنی بات پر اَڑ گئے تو بھلا کام کیسے ہو۔ اور بھئی اتنا ہی نہیں، ایک دن تو سب میں ایسی ضدّم ضِدّا ہوئی کہ غصے میں آکر بنی بنائی دیوار گرادی اور کام رکوا دیا۔ کچھ دن آپس میں روٹھے رہے، لیکن پھر سوچ کر کام شروع کرا دیا۔ دیواریں جب پھر کچھ اونچی ہوگئیں تو پھر رنگوں میں جھگڑا ہوگیا۔ اور پھر سب نے دیواریں گرادیں۔

گھر تو یہ ہو رہا تھا، وہاں شہر میں ان کا باپ خوش تھا کہ مکان قریب قریب بن گیا ہوگا۔ ایک دن وہ خوش خوش شہر سے چلا۔ گھر آیا تو دیکھا یہاں کچھ بھی نہیں بنا ہے۔ اس نے لڑکوں کو بلایا۔ حال پوچھا تو ساری بات معلوم ہوئی کہ رنگوں پر سب آپس میں لڑ پڑے اور ضد میں یہ سب کچھ بگڑا۔

یہ سارا حال سنا تو باپ غصہ ہونے کے بدلے مسکرایا۔ اس نے کہا۔ "اچھا بھئی یہی سہی۔ اب تم سب پہلے رنگوں کا فیصلہ کرلو۔ فیصلے کے بعد ہی مکان بنے گا۔" یہ کہہ کر باپ بھی شہر چلا گیا۔

یہاں جو جھونپڑا پڑا تھا وہ نیا گھر بننے سے کھود ڈالا گیا تھا۔ اب ایک طرف چاروں بیٹے پال ڈال کر رہ رہے تھے۔ سوچا یہ تھا کہ جب

مکان بن جائے گا تو اس میں رہنے لگیں گے۔

اچھا اب سنیے۔ مزا آئے گا تم کو سننے میں اور ان چاروں بیٹوں کو بھی گرمی میں خوب مزا آئے گا۔

گرمی کا موسم آیا تو اپنے ساتھ گرم ہوا اور آندھیاں لایا۔ آندھیاں چلیں تو پال اڑ گئے۔ دھوپ سے بچنے کا سہارا بھی گیا۔ گرمی کے مارے خوب پریشان ہوئے ـــــ پھر آئی برسات ـــــ ساری برسات سر پر ہوئی۔ سب بیمار بھی ہوئے اور ان کا سارا سامان بھی برباد ہوا۔ اب عقل ٹھکانے آئی۔ سوچا کہ مکان تو بنا نہیں، دروازے اور کواڑ تو لگے نہیں۔ پہلے سے ہی بے کار میں اپنی اپنی لے اڑے۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اگر مکان بن گیا ہوتا تو آج آرام سے بیٹھے ہوتے۔ اب جب تکلیف پہنچی تو اپنی اپنی ضد پر شرمائے۔ انھوں نے شہر سے باپ کو بلوایا اور بولے کہ ہم سے بڑی بھول ہوگئی۔ اب آپ جیسا چاہیں مکان بنوا دیجیے۔ ہم اب کچھ نہ کہیں گے۔

یہ سن کر باپ نے سمجھایا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ اپنی اپنی پسند بھی ہوتی ہے لیکن ایسا نہیں کرتے کہ اپنی پسند کے آگے دوسروں کا خیال نہ کیا جائے۔ دوسروں کی پسند کا بھی خیال ہونا چاہیے۔ کسی پر زبردستی نہیں ہونا چاہیے۔ سارے کام بگڑتے اسی لیے ہیں کہ لوگ اپنی من مانی

کرنا چاہتے ہیں اور دوسروں پر زبردستی کرتے ہیں ۔ خیر اب بھی تمہاری سمجھ میں بات آگئی ۔ چلو اچھا ہی ہوا ۔ اچھا پھر سے کام شروع کرادو ۔

باپ کی مرضی ہو ئی ۔ کام شروع کرادیا گیا ۔ مکان بننے لگا ۔ مکان بن کر تیار بھی ہو گیا ۔ سب اس میں رہنے لگے اور آرام سے زندگی کے دن کاٹنے لگے ۔ پھر اپنی اپنی کوٹھری کے کواڑ اور دروازے سب نے اپنی اپنی پسند کے رنگ لیے ۔ بس کہانی ختم ۔
